جاوید نامہ

فلک مشتری (اردو ترجمہ)

حلاّج، غالب اور قرۃ العین طاہرہ کی روحیں جنھوں نے بہشت میں قیام پسند نہیں کیا
اور گردشِ جاوداں اختیار کی

سیّد سراج الدین

میں دلِ دیوانہ پر اپنے فدا
بخشتا ہے ہر گھڑی جو مجھ کو
ویرانہ نیا
جب ٹھہرتا ہوں تو کہتا ہے کہ اُٹھ
عاشقوں کے واسطے تو یہ سمندر بھی ہے جھیل
چوں کہ آیاتِ خدا ہیں ان گنت، لا انتہا
ختم ہوسکتا نہیں تیرا سفر اور راستہ
دیکھتی ہے عقل بھی لیکن
نتیجہ اُس کا نا آسودگی
دیکھنا عرفان کا افزونیِ ذوقِ نظر
کارِ حکمت کا ترازو ہے ہنر
کارِ عرفاں کا نظر!
دسترس حکمت کی آب و خاک پر
عرفاں کی جانِ پاک پر
ایک کے ہاں ہے تجلّی غور کرنے کے لیے
دوسرے کے پاس سینے میں اترنے کے لیے
نو بہ نو جلووں کی ہے مجھ کو تلاش

اور نالاں مثلِ نے
کرتا ہوں میں افلاک طے
ایک مردِ پاک دل کا ہے یہ فیض
سوز سے جس کے مجھے بھی
سوزِ جاں حاصل ہوا
رومی اور میں
جو کہ تھے محوِ تماشائے وجود
چل کے آ پہنچے کنارِ مشتری
مشتری، وہ اک جہانِ ناتمام
چاند جس کے تیز گام
اُس کا شیشہ مے سے خالی تھا ابھی
آرزو کوئی ابھی جاگی نہ تھی
چاند اُس کے گرد جو گردش میں تھے
روشنی سے اُن کی مثلِ نیم روز
اُس کی آدھی رات بھی
اور ہوا ایسی تھی اُس کی
جس میں سردی بھی نہیں تھی
اور گرمی بھی نہ تھی
جب نظر کی میں نے سوئے آسماں
تارے مجھ سے اس قدر نزدیک تھے
اُن کی ہیبت سے مرے ہوش اُڑ گئے
میں نے دیکھیں تین روحیں پاک باز
ایک آتش سے تھے دل اُن کے گداز
لالہ گوں اُن کی قبا
سوزِ جاں سے اُن کا رخ رخشندہ تھا
اُن میں سوزِ گرمی روزِ الست
اپنے ہی نغموں سے مست
مجھ سے رومی نے کہا:

''اس قدر بھی ہوش تو اپنا نہ کھو
دم سے ان آتش نواؤں کے
تو خود بھی زندہ ہو
اب تلک جو شوقِ بے پروا نہ دیکھا تھا
وہ دیکھ
زور جس مے کا نہ دیکھا تھا وہ دیکھ
غالب و حلّاج ہیں یہ اور یہ روحِ طاہرہ،
وہ عجم کی شاعرہ،
شور ہے ان کی نواؤں سے حرم کی روح میں
بخشتی ہیں یہ نوائیں روحِ انساں کو ثبات
ان کی گرمی گرمیِ سوزِ درونِ کائنات،

نوائے حلّاج

تو اپنی خاک سے لے آگ جو ہویدا نہیں
کہ شعلہ دوسرے کا لائق تقاضا نہیں
نظر جمالی ہے اپنے پہ، ویسے جلوۂ دوست
ہے ہر جگہ پہ مجھے فرصتِ تماشا نہیں
نہ دوں یہ مصرع نظیری کا ملک جم کے عوض
وہ جو کہ کشتہ نہ ہوں وہ مرا قبیلہ نہیں
اگرچہ عقل کے ہمراہ ایک لشکر ہے
تو دل گرفتہ نہ ہو عشق بھی اکیلا نہیں
مقام و راہ سے واقف نہیں ہے تو ورنہ
نہفتہ بربطِ دلبر میں کون نغمہ نہیں
سنا کے ہم کو حکایت نہنگ و طوفاں کی
نہ کہہ کہ ناؤ مری روشناسِ دریا نہیں
ہوں ایسے رہروِ دقّت پسند کا قائل
کہ راہ وہ نہ چلے جس میں کوہ و دریا نہیں
شریکِ حلقۂ رنداں ہو پر نہ ہو ہرگز
اک ایسے پیر کی بیعت جو مردِ غوغا نہیں

نوائے غالب

جاوید نامہ میں بعض جگہ اقبال نے دوسرے شعرا کی غزلیں بھی رکھی ہیں۔ ان غزلوں کا میں نے نثر میں ترجمہ کیا ہے کیونکہ ایک تو وہ خود اقبال کی نہیں، جن کا ترجمہ میں کر رہا ہوں۔ دوسرے غزل کا ترجمہ غزل کی ہیئت میں کرنا اپنے آپ اور پڑھنے والوں دونوں پر ظلم ہے۔ البتہ جہاں کہیں اقبال نے خود اپنی غزل بہ زبانِ خود یا بہ زبان زندہ رود لکھی ہے، وہاں میں نے اس کے ترجمے کی جرأت کی ہے۔ (بہ مجبوری) غالب کی یہ معرکہ آرا غزل نثر میں کیا آئے گی لیکن چارہ نہیں۔

''آؤ کہ آسمان کا محور بدل دیں اور گردشِ جام سے تقدیر (کی گردش) پلٹ دیں
کوتوالِ شہر بھی اگر زبردستی پر اترے تو پروانہ کریں
اور اگر شاہِ وقت بھی تحفہ بھیجے تو قبول نہ کریں
اگر کلیم بھی ہم کلام ہوں تو کوئی جواب نہ دیں
اور خلیل بھی مہمان بننا چاہیں تو ٹال جائیں
جنگ پہ آجائیں تو گل چیں کو خالی ہاتھ باغ سے نکال دیں
اور اگر صلح کی بات ہو تو پھر پرواز کرتے پرندوں کو شاخساروں سے
آشیانوں کو لوٹا دیں
ہم تو حیدری ہیں کیا عجب کہ اگر چاہیں
تو سورج کا رُخ بھی مشرق کی طرف پھیر دیں''

نوائے طاہرہ

قرۃ العین طاہرہ کی اس غزل کا ہر دوسرا مصرعہ نا قابل ترجمہ ہے اور اگر دوسرا مصرعہ جوں کا توں رہے (سوائے ایک آدھ لفظ کے) تو پھر صرف پہلے مصرعے کا ترجمہ ضروری ٹھہرا

''تجھ کو میں دیکھ لوں اگر چہرہ بہ چہرہ رو بہ رو
غم کا ترے بیاں کروں نکتہ بہ نکتہ مو بہ مو
میں تری دید کے لیے مثل صبا بھٹکتی ہوں
خانہ بہ خانہ، در بہ در، کوچہ بہ کوچہ، کو بہ کو
تیرے فراق میں مری آنکھ سے خونِ دل رواں
دجلہ بہ دجلہ، یم بہ یم، چشمہ بہ چشمہ، جو بہ جو
عشق ترا بنا ہوا میری قماشِ جاں میں ہے
رشتہ بہ رشتہ، نخ بہ نخ، تار بہ تار، پو بہ پو
گھومی جو دل میں طاہرہ پایا تجھی کو ہر جگہ
صفحہ بہ صفحہ، لا بہ لا، پردہ بہ پردہ، تو بہ تو''

شور کچھ ان عاشقوں کے سوز سے
میرے دل میں بھی اُٹھے
کچھ پرانی مشکلیں تازہ ہوئیں
پھر مرے افکار پر شب خوں پڑا
میرے بحرِ فکر میں طوفاں اُٹھا
''وقت مت کھو'' مجھ سے رومی نے کہا
''کھولنا گر چاہتے ہو ہر گرہ
کب تلک تم یوں رہو گے اپنے ہی
افکار میں
آخر اسیر
جو قیامت تم میں برپا ہے اُسے
لاؤ بیرونِ ضمیر''

زندہ رود اپنی مشکلات ارواحِ بزرگ کے سامنے پیش کرتا ہے

یہ تمھاری جنت الفردوس سے
دوری ہے کیا؟
جو مقام مومناں ہے اُس سے
مہجوری ہے کیا؟

حلاّج

قید جنت کی نہیں ہے
ہم سے آزادوں کو راس
جنتِ مُلا مے و حور و غلام
جنتِ آزادگاں سیرِ دوام!
جنتِ مُلا ہے خورد و نوش اور خواب و سرود
جنتِ عاشق تماشائے وجود!
شق قبر اور صور ہے مُلا کا حشر
عشق عاشق کے لیے خود صبح حشر
علم کی بیم و رجا پر ہے اساس
نے اُمید عاشق کے دل میں نے ہراس
علم مرعوب جلالِ کائنات

عشق مسحورِ جمال کائنات
علم کی وقت اور زمانے پر نظر
عشق اس سے بے نیاز
علم ہے لاچار اور پابستۂ قانونِ جبر
عشق آزاد و غیور و ناصبور
ایک پل سوئے تماشائے وجود
جو ہمارا عشق ہے یہ شکووں سے
بیگانہ ہے
گرچہ حاصل اس کو بھی اک گریۂ
مستانہ ہے
ہم نہیں مجبور اپنے اس دلِ مجبور کے
ہم نہیں گھایل نگاہ حور کے
آتش دل کو ہے بھڑکاتا فراق
ہے ہماری جاں کو راس آتا فراق
بے خلش جینا کوئی جینا نہیں
زندگی گزرے تو یوں
جیسے ہو آتش زیرِ پا
اس طرح جینا ہے تقدیرِ خودی
اس طرح تعمیر ہوتی ہے خودی
انتہائے شوق سے بنتا ہے ذرہ رشکِ مہر
اور سما جاتے ہیں اُس میں نو سپہر
حملہ اِس عالم پہ جب کرتا ہے شوق
فانیوں کو جاوداں کرتا ہے شوق

زندہ رود

گردشِ تقدیر موت اور زندگی
کون جانے کیا حقیقت ہے بھلا
تقدیر کی

حلّاج

ہو گیا خود ساتھ جو تقدیر کے
موت بھی، ابلیس بھی اُس سے ڈرے
جبر مردوں کے لیے قوّت ہے
ان کا دیں ہے، کمزوری نہیں
مردِ پختہ جبر سے ہے پختہ تر
جبر حق میں خام کے آغوشِ قبر
وہ جو خود ہم کو ہلا دے، اپنا جبر
وہ جو دنیا کو ہلا کے رکھ دے وہ
خالدؓ کا جبر
کام مردوں کا ہے تسلیم و رضا
کمزور کے بس کا نہیں
جانتا ہے تو تو رومی کا مقام
کیا نہیں ہے یاد اُن کا یہ کلام؟

''عہد بایزید میں ایک گبر تھا جس سے ایک نیک مسلمان نے یہ کہا کہ کیا ہی اچھا ہوا اگر تو ایمان لے آئے تا کہ نجات اور سروری تیرے ہاتھ آئے۔ گبر بولا: اگر ایمان وہ ہے جو شیخ عالم بایزیدؒ نے اختیار کیا ہے تو مجھے معاف کرو کہ وہ میرے بس کا نہیں۔''

ہے ہماری زندگی قائم اُمید و بیم پر
ہمت تسلیم ہر اک میں کہاں؟
تو جو کہتا ہے کہ جو ہونا ہے ہوتا ہے وہی
تقدیر ٹل سکتی نہیں
معنٰی تقدیر کیا ہے تو نے سمجھا ہی نہیں
نے خودی ہی تو نے دیکھی نے خدا
مردِ مومن کا خدا سے ہے نیاز
وہ خدا کے ساتھ اور حق اُس کے ساتھ
عزم اُس کا خالقِ تقدیر حق
تیر روزِ جنگ اُس کا تیرِ حق

زندہ رود

کم نگاہوں نے بتا یہ کیا کیا
ایک مردِ حق کو دی ایسی سزا
تجھ پہ تو ظاہر ہے پنہانِ وجود
یہ بتا تیرا گنہہ آخر تھا کیا؟

حلّاج

میرے سینے میں تھی پنہاں بانگِ صور
ایک ملت جا رہی تھی سوے گور
مومنوں میں بھی تھی بوئے کافری
لا الٰہ لب پر مگر خود اپنے منکر آپ ہی
روح انسانی جو حکم رب سے ہے
اُس کو یہ بے اصل سمجھے
چوں کہ رشتہ اس کا آب وگل سے ہے
میں نے بھڑکائی خود اپنے آپ میں
نارِ حیات
وہ جو مردہ تھے بتائے اُن کو
اسرارِ حیات
ہے خودی پر بس کہ بنیادِ وجود و زندگی
ہے خودی وہ جس میں یکجا
دلبری اور قاہری
ہر کہیں ظاہر خودی، پنہاں خودی
اُس میں مخفی نور بھی اور نار بھی
اُس کے جلووں ہی سے ہے دنیا بھری
ہر زماں در پردہ ہر دل نے
اُسی کی بات کی
جس کسی نے آگ سے اُس کی
نہیں پایا نصیب
خود سے بیگانہ رہا
واقف اُس کے نور سے ایران بھی اور ہند بھی

نار سے لیکن نہیں آ گہ کوئی
میں نے نور و نار دونوں سے انہیں
آ گہ کیا
بس گنہ میرا یہ تھا
جو کیا تھا میں نے تو نے بھی وہی
اک حشر سا برپا کیا
بس تو بھی ڈر

طاہرہ

ہے گناہِ بندۂ صاحب جنوں
وہ کہ جس سے کائناتِ تازہ
آتی ہے بروں
سارے پردے چاک کر دیتا ہے شوق
کہنگی کو دور کر دیتا ہے شوق
گو بالآخر دار ہے اُس کا نصیب
چھوٹتا اُس سے نہیں کوئے حبیب
ویسے دنیا سے گزر جاتا ہے وہ
نور رہ جاتا ہے باقی
اُس کا شہر و دشت میں
خود ضمیرِ عصر میں پوشیدہ ہو جاتا ہے وہ
جانے کیسے ایسی خلوت میں سما جاتا ہے وہ!

زندہ رود

اے کہ در دِ جستجو تجھ کو ملا
ایک اپنے شعر کے معنی بتا
''قمری کفِ خاکستر و بلبل قفسِ رنگ
اے نالہ نشانِ جگرِ سوختہ کیا ہے''

غالب

نالہ جو اٹھے جگر کے سوز سے
ہر جگہ تاثیر اُس کی میں نے دیکھی ہے جدا
قمری اُس سے سوختہ

بلبل میں رنگ
موت کی آغوش میں یاں ہے حیات
ایک جا یہ زندگی، اک جا ممات!
اس میں صد رنگی بھی بے رنگی بھی ہے
تو نہیں واقف کہ کیا ہے
یہ مقامِ رنگ و بو
یاں تو ہر اک دل کی قسمت ہے
بقدرِ ہائے و ہو
رنگ ہو یا کہ ہو بے رنگی
تو اس میں ڈوب یا اُس سے گزر
تا کہ حاصل ہو تجھے سوزِ جگر

زندہ رود

سو جہاں ہیں اِس فضا میں، یہ بتا
اولیا اور انبیا بھی ہیں
ہر اک عالم میں کیا

غالب

غور سے دیکھو اگر تم تو یہاں
ہر گھڑی پیدا ہے اک تازہ جہاں
اور ہو ہنگامۂ عالم جہاں
رحمۃ للعالمین بھی ہے وہاں!

زندہ رود

کھول کر مجھ کو بتا، ہے فہم میری نارسا

غالب

بات یہ ایسی ہے جس کو فاش کہنا ہے خطا

زندہ رود

گفتگوئے اہل دل کا کیا کوئی حاصل نہیں؟

غالب

لب تلک نکتہ یہ آ سکتا نہیں

زندہ رود

تو کہ تجھ میں آتش سوزِ طلب
تو نہیں اظہار پر قادر۔ عجب!

غالب

خلق و تقدیر و ہدایت ابتدا
رحمۃ للعالمینی انتہا!

زندہ رود

میں نے کچھ سمجھا نہیں، ہو تجھ میں گر
آتش تو دے مجھ کو جلا!

غالب

شعر کے اسرار سے واقف ہے تو
میری طرح
پر یہ باتیں شعر کے بس کی نہیں
شاعروں کی بزم ہے آراستہ
لیکن یہاں
ہیں کلیم ایسے جنہیں حاصل
ید بیضا نہیں
تو جو مجھ سے چاہتا ہے وہ تو ہے
اک کافری
کافری جو ہے، ورائے شاعری

حلّاج

جس جگہ بھی ہے جہانِ رنگ و بو
خاک میں جس کی ہے تخمِ آرزو
مصطفیٰؐ کے نور سے اُس کی بہا
یا ہے اُس کو جستجوے مصطفیٰؐ

زندہ رود

پوچھتا ہوں تجھ سے میں
گو پوچھنا بھی ہے خطا

راز اُس جوہر کا کیا ہے
نام جس کا مصطفیٰؐ ؟

حلّاج

اُس کے آگے تو ہے عالم سجدہ ریز
عبدہٗ اپنے کو ہے اُس نے کہا
عبدہٗ ہے فہم سے تیری سوا
کیوں کہ آدم بھی ہے وہ، جوہر بھی ہے
جوہر اُس کا نے عرب ہے نے عجم
آدمی ہے اور آدم سے سوا
عبدہٗ صورت گرِ تقدیر بھی
اُس میں ویرانہ بھی اور تعمیر بھی
جاں فزا بھی عبدہٗ اور جاں ستاں
ہے وہ شیشہ بھی وہی سنگِ گراں
عبد کچھ ہے، عبدہٗ کچھ اور ہے
عبدہٗ سے دہر ہے اور دہر خود ہے عبدہٗ
ہم سراسر رنگ، وہ بے رنگ و بو
ابتدا رکھتا ہے پر بے انتہا ہے عبدہٗ
عبدہٗ آزاد صبح و شام سے
کوئی کب واقف ہے اس کے راز سے
عبدہٗ بس راز الا اللہ ہے
لا الہ گر تیغ ہے تو عبدہٗ ہے
اُس کی دھار
فاش کہنا ہو تو 'ھو' ہے عبدہٗ
عبدہٗ چند و چگوں، رازِ درونِ کائنات
بات واضح کر نہیں سکتے یہ بیت
جب تلک سمجھو نہ رمزِ ''مار میت''
چھوڑ اِن باتوں کو اب اے زندہ رود
اور ہو جا سر بسر غرق وجود

زندہ رود

عشق کو پہچانتا کم ہوں، بتا
یہ ہے ذوق دید کیا دیدار کیا؟

حلاّج

چاہیے تجھ کو جو دیدارِ رسولؐ
خود کو کر لے تابعِ حکمِ رسولؐ
زندگی تیری ہو سنت پر ڈھلی
تا کہ انس و جاں میں ہو مقبول تو مثلِ نبیؐ
پھر نظر اپنے پہ کر، ہے بس یہی
اسرارِ دیدارِ نبیؐ

زندہ رود

کیا ہے دیدارِ خدائے نہ سپہر
جس کے زیرِ حکم چرخ و ماہ و مہر؟

حلاّج

نقش حق پہلے تو کرنا حرزِ جاں
پھر اُسے لانا سوے بزمِ جہاں
نقش جاں عالم میں جب ہوگا تمام
دیدِ حق ہو جائے گی دیدارِ عام
اے خوشا وہ مرد جس کی ایک ہُو
آسمانوں کو کرے زیرِ نگیں
وائے وہ درویش جو ھُو تو کرے
اور پھر کھولے نہ لب، دم سادھ لے
حرفِ حق کو جگ میں پھیلائے نہیں
بس رہے گوشہ نشیں
مثلِ حیدرؓ جس میں کراری نہ ہو
خانقہ اور راہبی چن لے جو خیبر
اور سلطانی کو چھوڑ
نقشِ حق رکھتا ہے تو تو یہ جہاں
نخچیر ہے

ہم عناں تدبیر کی تقدیر ہے
دورِ حاضر چاہتا ہے تجھ سے جنگ
پھیر دے تو نقشِ حق کا اُس پہ رنگ

زندہ رود

نقشِ حق دنیا میں جو رکھا گیا
میں نہیں سمجھا کہ یہ کیسے ہوا

حلاّج

اس کے پیچھے یا ہے زورِ دلبری
یا قاہری
دلبری ہے قاہری سے خوب تر
اس میں حق ہے کچھ زیادہ
جلوہ گر

زندہ رود

اے کہ تو ہے واقف اسرارِ شرق
کیا ہے، بتلا زاہد و عاشق میں فرق

حلاّج

عالمِ دنیا میں زاہد اجنبی
عالمِ عقبیٰ میں عاشق اجنبی

زندہ رود

ہے فنا گر معرفت کی انتہا
تب فنا میں زندگی مضمر ہے کیا؟

حلاّج

یار جس پر مست ہیں وہ اک تہی پیمانہ ہے
معرفت سے نیستی، بیگانہ ہے
نیستی میں ڈھونڈنا، مقصود کو
ہے عدم میں ڈھونڈنا، موجود کو!

زندہ رود

وہ کہ جس نے
خود کو اونچا نسلِ آدم سے گنا
جام میں اُس کے نہ مے باقی نہ دُرد
خاک ہیں پر ہے ہماری خاک
گردوں آشنا
نار ہے جو، اُس کی آتش ہے کہاں؟

حلّاج

وہ، ارے وہ خواجۂ اہل فراق
اُس کو تم کچھ مت کہو
وہ ازل کا تشنہ لب خونیں ایاق
ہم ہیں جاہل، وہ حقیقت آشنا
وہ واقفِ رازِ وجود
ہے اُسی کا کفر، جس سے ہم پہ یہ عقدہ کھلا
لطف اٹھنے کا ہے گرنے سے جڑا
اور ہے گھٹنے سے بڑھنے کا مزہ
عاشقی جلنا ہے، اُس کی آگ میں
سوختن بے سود آتش کے سوا
عشق و خدمت میں ہے کیا اُس کا مقام
آدمی اس راز کا محرم نہیں
چاک کر دو پیرہن تقلید کا
تا کہ لو اُس سے سبق توحید کا

زندہ رود

اے کہ قبضے میں ترے اقلیم جاں
ٹھہر جا صحبت یہ ملتی ہے کہاں؟

حلّاج

ٹھہرنے دیتا نہیں ہے ذوقِ پرواز
ایک جا

ہر گھڑی دید اور تڑپ ہے اپنا کام
اک سدا پروازِ بے پر، بے مقام

ابلیس کا نمودار ہونا

صحبت ان روشن دلوں کی بس دو دم
ہیں یہی دو دم مگر
سرمایۂ بود و عدم
کر دیا ان اک دو لمحوں نے مرے بھی
عشق کو شوریدہ تر
اور عقل کو صاحب نظر
بند کر لی آنکھ میں نے تا کہ یہ
دل میں اتر جائے مرے
یک بیک کیا دیکھتا ہوں میں جہاں تاریک ہے
سب مکاں تا لامکاں، تاریک ہے
ایک شعلہ اس اندھیری رات میں
آیا نظر
اور اس شعلے سے مرد پیر اک ظاہر ہوا
تھی سرمئی اُس کی قبا
اک دھویں میں غرق پیکر اُس کا تھا
مجھ سے رومی نے کہا
''دیکھ یہ ہے خواجۂ اہل فراق
یہ سراپا سوز اور خونیں ایاق
کہنہ اور کم خندہ برلب، کم سخن
آنکھ تیز اتنی کہ ہے بینائے جاں اندر بدن!
رند بھی، ملا بھی، دانشمند بھی
اور خرقہ پوش
مثل زاہد کے عمل میں سخت کوش
فطرتاً بیگانۂ ذوقِ وصال
زہد اُس کا تارکِ قربِ جمال

چوں کہ یہ ترک جمال آساں نہ تھا
اُس نے ترکِ سجدہ کا حیلہ کیا
اک ذرا دیکھو تم اُس کے واردات
اُس کی ساری مشکلات، اُس کا ثبات
غرقِ رزمِ خیر و شر میں آج تک
سو پیمبر اُس نے دیکھے
اور کافر آج تک
اُس کے غم نے میرا دل تڑپا دیا
آہ لب تک اُس کی آئی
مجھ کو دیکھا اور کہا:
''یاں عمل میں کون ہے مجھ سے سوا
اس قدر الجھا ہوں کام میں
جمعہ کے دن بھی مجھے فرصت نہیں
نے فرشتہ کوئی میرا، اور نہ ہے
چاکر کوئی
وحی کو میری میسر ہے
نہ پیغمبر کوئی
نے حدیثیں میری نے کوئی کتاب
بن گیا ہوں میں فقیہوں کے لیے
پھر بھی عذاب
ان فقیہوں نے کیا
دیں کو خراب
کعبے کے ٹکڑے کیے
مختلف اس کیش سے ہے میرا دیں
مذہبِ ابلیس میں فرقے نہیں
پیشِ آدم کر کے سجدے سے حذر
میں نے ہی چھیڑا تھا سازِ خیر و شر
میں وجودِ حق کا بھی منکر نہیں
میرا ظاہر تو ہے یہ، باطن نہیں

دیکھ کر انکار کر دوں
اتنا میں ناداں نہیں!
سامنے اہل جہاں کے میرا یہ انکار ہے
اس میں پنہاں پر مرا اقرار ہے
میرے ناگفتہ سے بہتر ہے مگر میرا کہا
قہرِ یزداں دردِ آدم کے سبب
میں نے سہا!
کشت سے میری ہی ہر شعلہ اُٹھا
ہو گیا مختار جو مجبور تھا
کر کے خود اپنی برائی آشکار
میں نے بخشا تجھ کو لطفِ اختیار
تو میری گتھی کو سلجھا
جل رہا ہوں، آگ سے
مجھ کو بچا
اے کہ میرے دام میں ہے تو پھنسا
کر کے شیطاں کو گنہ میں مبتلا
تجھ کو جینا ہے تو سُن
باہمتِ کردار جی
اے مرے غم خوار آدم
مجھ سے تو بیگانہ جی!
اس جہاں میں مجھ سے بیگانہ گزر
تا نہ ہو نامہ مرا تاریک تر
یاں کوئی صیاد بے نخچیر
ہو سکتا نہیں
جب تلک نخچیر ہے تو، میرے ترکش
میں ہیں تیر
صاحبِ پرواز اگر ہے تو
تو گر سکتا نہیں
صید ہو زیرک تو کچھ صیاد

کر سکتا نہیں''!
میں نے کہا
''ساری چیزوں سے ہے بڑھ کر
ناپسندیدہ طلاق''
بولا ''سازِ زندگی سوزِ فراق
اے خوشا سرمستیِ روزِ فراق!
وصل کی میں بات کر سکتا نہیں
وصل اگر چاہوں تو وہ باقی نہ میں''
وصل کی باتوں نے اُس کو
خود سے بیگانہ کیا
اُس کا سوز و درد پھر تازہ ہوا
ایک پل اپنے دھویں میں غرق اور غلطاں رہا
اور پھر گم ہو گیا
ایک نالہ پھر ہوا اس دود پیچاں سے بلند
ہے مبارک جاں کہ ہو جو دردمند

نالۂ ابلیس

اے خدا، اے تیری قدرت میں
صواب و ناصواب
صحبتِ اولادِ آدم نے کیا
مجھ کو خراب
حکم سے میرے نہ کی ظالم نے سرتابی کبھی
اُس کی فطرت ہی ہے عاری
جرأتِ انکار سے
خاک میں اُس کی نہیں ہے
کبریائی کا شرر
صید ایسا ہے کہ خود صیاد کو دعوت جو دے
صید ایسا ہو تو اُس سے الامان والحذر
میری پچھلی طاعتوں کو یاد کر
مجھ کو ایسے صید سے آزاد کر

پست ہمت ہو گیا ہوں، اس سے میں
ہائے میں، اے وائے میں!
اُس کی فطرت خام، عزم اس کا ضعیف
میری تو اک ضرب کی بھی تاب لا سکتا نہیں
ایسا حریف
چاہیے مجھ کو تو کوئی بندۂ صاحب نظر
اک حریفِ پختہ تر
یہ تو بچوں کا کھلونا ہے، بھلا
کیا کرے گا اس کو لے کر مجھ سا پیر
ابن آدم تو ہے بس اک مشتِ خس
ایک چنگاری ہے مشتِ خس کو بس
کچھ نہیں عالم میں گر خس کے سوا
آگ اتنی مجھ کو کیوں بخشی بتا!
شیشہ پگھلانا ہے معمولی سا کام
ہاں اگر پتھر کو پگھلائیں
تو پھر کچھ بات ہے!
تنگ اپنی کامیابی سے ہوں میں خود
اے خدا
اب بدل اس کا مجھے کچھ کر عطا
کوئی منکر میرا ہم پلہ کوئی مردِ خدا
مجھ کو خاطر میں نہ لائے
کانپ اٹھوں جس کی نظر سے
ایسا بندہ ہو عطا
جو مجھے یہ کہہ سکے ''بس دور ہو
اب یاں سے جا''!
مجھ کو اب دے ایسا مردِ حق پرست
جس سے میں کھاؤں شکست!